27

اس زمانہ میں اسلام کی فتح اور مسلمانوں کا غلبہ محض تبلیغ سے وابستہ ہے

(فرمودہ 12 نومبر 1943ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"انسانی دماغ کچھ اس قسم کا بنا ہؤا ہے اور یہ بے حکمت بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کئی حکمتیں رکھی ہیں کہ جب انسان کو جوش آجاتا ہے اس وقت اپنی طاقت اور اپنے مخالف کی طاقت کا موازنہ نہیں کیا کرتا۔ بسا اوقات ایک چھوٹا بچہ ایک بڑے آدمی پر غصہ میں کُود پڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ گویا وہ اس کو مار کر گرا دے گا حالانکہ وہ اس کے ایک تھپڑ کو برداشت کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ بعض مواقع اس حالت کے ایسے ہوتے ہیں کہ اس میں انسان کا اپنی جان کو قربان کر دینا اور مخالف حالات اور خطرات کی پرواہ نہ کرنا غیرت کہلاتا ہے اور بعض مواقع قوموں پر یا انسانوں پر ایسے بھی آتے ہیں جب اس قسم کے حالات میں دشمن پر حملہ کر دینا تہوّر اور دیوانگی کہلاتا ہے۔ گویا ایک ہی فعل بعض حالات میں غیرت بن جاتا ہے اور بعض دوسرے حالات میں دیوانگی اور تہوّر کہلاتا ہے۔ جب یہ حملہ اور مقابلہ کسی ایسی چیز کے لئے ہو جس کے متعلق انتظار کرنا یا نہ کرنا بے فائدہ بات ہو اور جب یہ حملہ کسی ایسی چیز کے لئے ہو جسے کسی صورت میں کسی حد تک بھی قربان نہ کیا جا سکتا ہو اس وقت

اس قسم کی حالت غیرت کہلاتی ہے۔ لیکن جب ایسا ہی فعل کسی انسان سے اُس وقت صادر ہو جب اس امر کے متعلق انتظار اس کے لئے یا اس کی قوم کے لئے مفید ہو اور اس انتظار میں کسی بہتری کی امید ہو اور جبکہ وہ چیز جس کے لئے اسے غصہ آیا ہے ایسی ہو کہ اس میں انسان کسی قسم کا سمجھوتہ کر سکتا ہے اور ایک حد تک یا کلی طور پر تو اس صورت میں یہ مقابلہ تہوّر اور دیوانگی کہلاتا ہے۔ اس لئے کہ پہلی صورت میں جب انتظار کرنا یا نہ کرنا اس کے لئے برابر تھا۔ اگر وہ انتظار کرتا تب بھی اور اگر انتظار نہ کرتا تب بھی اسے کسی ایسی چیز کی قربانی دینی پڑتی تھی جسے قربان کرنا کسی صورت میں بھی کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ تو ایسی صورت میں اگر وہ دب جاتا ہے اور دشمن کا مقابلہ نہیں کرتا تو یقیناً وہ بے غیرت کہلائے گا کیونکہ گو وہ کمزور تھا مگر اس کے دب جانے سے اس کی قوم کو کیا فائدہ ہؤا۔ اگر وہ باوجود اپنی کمزوری کے مقابلہ کے لئے کھڑا ہو جاتا اور اس مقابلہ میں اپنی جان دے دیتا تو کم سے کم دنیا میں اپنا نام چھوڑ جاتا اور لوگ یہ سمجھتے کہ اس نے مرنا قبول کر لیا مگر ذلت اور رسوائی کی زندگی کو برداشت نہیں کیا۔ ان امور میں سے سب سے اہم چیز دین ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی بڑی بھاری طاقت یا حکومت ہو اور وہ ایک کمزور اور ضعیف انسان کو پکڑ کر کہے کہ تو خدا تعالیٰ کی عبادت چھوڑ دے یا مثلاً مذہب اور عقیدہ جسے انسان کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا اسے کوئی حکومت چھوڑنے کے لئے مجبور کرے تو چونکہ مذہب یا عقیدہ ایسی چیز نہیں جسے انسان ایک دن بلکہ ایک منٹ کے لئے بھی چھوڑ سکے اور نہ یہ ایسی چیز ہے جس کے متعلق انتظار اسے کوئی فائدہ دے سکے بلکہ ہر گھڑی جو مذہب کے بغیر گزرتی ہے وہ کفر میں گزرتی ہے۔ ہر گھڑی جو مذہب کے بغیر گزرتی ہے وہ ظلمت اور تاریکی میں گزرتی ہے۔ اس لئے ایسی صورت میں چاہے مقابل والا کیسا ہی زبردست ہو اور جس نے مقابلہ کرنا ہے وہ چاہے کتنا ہی کمزور اور ناطاقت ہو جیسے کہا جاتا ہے چنا پہاڑ سے ٹکرا گیا اسی طرح اگر اس کے دل میں غیرت ہو گی، اگر اس کے دل میں ایمان ہو گا تو وہ چنا پہاڑ سے ٹکرانے سے گریز نہیں کرے گا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کمزور تھے، ناطاقت تھے، کوئی دنیوی طاقت ان کے پاس نہ تھی، لڑنے کے سامان ان کے پاس موجود نہ تھے۔ اُدھر نمرود جس سے مقابلہ کے لئے وہ کھڑے ہوئے وہ بادشاہ تھا، بڑی طاقت

اور قوت رکھنے والا تھا اور اس وقت کی مہذب دنیا میں اپنے سازوسامان اور اپنی طاقت و قوت کی وجہ سے ایک بڑا رتبہ رکھتا تھا مگر باوجود اپنی کمزوری اور نمرود کی طاقت کے اور باوجود اس کے کہ اُن کی قوم بھی ان کی مخالف تھی وہ نمرود کے مقابلہ میں کھڑے ہوگئے اور اپنے مذہب اور عقیدہ کو پیش کرنے سے باز نہ آئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہؤا۔ فرعون ان کے مقابلہ کے لئے نکلا اور مصری حکومت نے انہیں تباہ و برباد کرنا چاہا۔ مصری حکومت اپنے زمانہ میں اعلیٰ درجہ کی مہذب حکومتوں میں سے سمجھی جاتی تھی اور لوگوں کے لئے ملجاو ماویٰ تھی۔ علوم وفنون سیکھنے کے لئے لوگ مصری تہذیب کے محتاج تھے۔ تہذیب و تمدن میں وہ مصری حکومت کے نمونہ کو اپنے سامنے رکھتے تھے اور ہر بات میں مصری قوم کی اقتداء اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ لوگ دور دور سے مصر جاتے اور ان کی قوم سے علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کے سبق سیکھتے۔ اس کی فوجوں نے لڑائی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کئی قسم کی نئی باتیں دریافت کی ہوئی تھیں جو دوسری حکومتوں کی افواج کو معلوم نہیں تھیں۔ لڑائی میں گاڑیوں سے کام لینا سب سے پہلے مصریوں نے ہی ایجاد کیا اور پھر ان کو دیکھ کر دوسرے لوگوں نے کام لینا شروع کر دیا۔ غرض مصری حکومت اپنے زمانہ میں نہایت نامور حکومت تھی اور اس کا بادشاہ اپنی طاقت و قوت پر ناز رکھتا تھا۔ ایسے بادشاہ کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی مگر باوجود اس کے جب وہ بادشاہ کے پاس گئے تو گو بادشاہ نے ان کو ڈرایا دھمکایا اور انہیں اور ان کی قوم کو تباہ و برباد کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں بھی مٹا دیا جائے گا اور تمہاری قوم کو بھی مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام باز نہ آئے اور انہوں نے کہا کہ جو پیغام مجھے خدا نے دنیا کے لئے دیا ہے وہ میں ضرور پہنچاؤں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سے روک نہیں سکتی۔ یہی حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ یہی حال محمد صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا تھا اور ایسی ہی حالت ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دیکھی۔ ساری قومیں آپ کی مخالف تھیں، حکومت بھی ایک رنگ میں آپ کی مخالف ہی تھی۔ گو آخری زمانہ میں یہ رنگ نہیں رہا۔ بہرحال قومیں آپ کی مخالف تھیں۔ تمام مذاہب کے پیرو

آپ کے مخالف تھے۔ مولوی آپ کے مخالف تھے۔ گدی نشین آپ کے مخالف تھے۔ عوام آپ کے مخالف تھے۔ اور امراء اور خواص بھی آپ کے دشمن تھے۔ غرض چاروں طرف مخالفت کا ایک طوفان برپا تھا۔ لوگوں نے آپ کو بہت کچھ سمجھایا۔ بعض نے دوست بن بن کر کہا کہ آپ اپنے دعووں میں کسی قدر کمی کر دیں۔ بعض نے کہا کہ اگر آپ فلاں فلاں بات چھوڑ دیں تو سب لوگ آپ کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے مگر آپ نے ان میں سے کسی کی بھی پرواہ نہ کی اور ہمیشہ اپنے دعویٰ کو پیش فرماتے رہے۔ اس پر شور ہوتا رہا، ماریں پڑتی رہیں، قتل ہوتے رہے مگر باوجود ان تمام تکالیف کے اور باوجود اس کے کہ آپ کا مقابلہ ایک ایسی دنیا سے تھا جس کا مقابلہ کرنے کی ظاہری سامانوں کے لحاظ سے آپ میں قطعاً طاقت نہ تھی پھر بھی آپ نے اپنے مقابلہ کو جاری رکھا بلکہ مجھے خوب یاد ہے میں نے متعدد بار حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنا کہ نبی کی مثال تو ویسی ہی ہوتی ہے جیسے لوگ کہتے ہیں کہ ایک گاؤں میں ایک پاگل عورت رہتی تھی جب بھی وہ باہر نکلتی چھوٹے چھوٹے لڑکے اکٹھے ہو کر اسے چھیڑنے لگ جاتے، اس کے ساتھ مذاق کرتے، اسے دق کرتے اور اسے بار بار تنگ کرتے۔ وہ بھی مقابلہ میں ان لڑکوں کو گالیاں دیتی اور بد دعائیں دیتی۔ آخر ایک دن گاؤں والوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ عورت مظلوم ہے اور ہمارے لڑکے اسے ناحق تنگ کرتے رہتے ہیں۔ مظلومیت کی حالت میں یہ انہیں بد دعائیں دیتی ہے کہیں ایسا نہ ہو اس کی بد دعائیں کوئی رنگ لائیں۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنے لڑکوں کو روک لیں تا کہ نہ وہ اسے تنگ کریں اور نہ یہ بد دعائیں دے۔ چنانچہ اس مشورہ کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ کل سے سب گاؤں والے اپنے لڑکوں کو گھروں میں بند رکھیں اور انہیں باہر نہ نکلنے دیں۔ چنانچہ دوسرے دن سب لوگوں نے اپنے اپنے لڑکوں سے کہہ دیا کہ آج سے باہر نہیں نکلنا اور مزید احتیاط کے طور پر انہوں نے باہر کے دروازوں کی زنجیریں لگا دیں۔ جب دن چڑھا اور وہ پاگل عورت حسبِ معمول اپنے گھر سے نکلی تو کچھ عرصہ تک وہ ادھر ادھر گلیوں میں پھرتی رہی۔ کبھی ایک گلی میں جاتی اور کبھی دوسری میں مگر اسے کوئی لڑکا نظر نہ آیا۔ پہلے تو یہ حالت ہؤا کرتی تھی کہ کوئی لڑکا اس کے دامن کو گھسیٹ رہا ہے، کوئی اسے چٹکی کاٹ رہا ہے، کوئی اسے دھکا دے رہا ہے،

کوئی اس کے ہاتھوں کے ساتھ چمٹا ہؤا ہے اور کوئی اسے مذاق کر رہا ہے۔ مگر آج اسے کوئی لڑکا دکھائی نہ دیا۔ دوپہر تک تو اس نے انتظار کیا مگر جب دیکھا کہ اب تک بھی کوئی لڑکا اپنے گھر سے نہیں نکلا تو وہ دکانوں پر گئی اور ہر دکان پر جا کر کہتی آج تمہارا گھر گر گیا ہے، بچے مَر گئے ہیں۔ آخر کیا ہؤا کیا ہے کہ وہ نظر نہیں آتے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس طرح اس نے ہر دکان پر جا کر کہنا شروع کیا تو لوگوں نے کہا گالیاں تو اس طرح بھی ملتی ہیں اور اُس طرح بھی۔ چھوڑو بچوں کو، ان کو قید کیوں کر رکھا ہے۔ آپ یہ حکایت بیان کر کے فرمایا کرتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام کا حال بھی اپنے رنگ میں ایسا ہی ہؤا کرتا ہے۔ دنیا ان کو چھیڑتی ہے، تنگ کرتی ہے، ان پر ظلم و ستم ڈھاتی ہے اور اس قدر ظلم کرتی ہے کہ ان کے لئے زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے اور ایک طبقہ کے دل میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ لوگ ظلم سے کام لے رہے ہیں انہیں نہیں چاہیئے کہ ایسا کریں مگر فرمایا وہ بھی دنیا کو نہیں چھوڑ سکتے۔ جب دنیا ان کو نہیں ستاتی تو وہ خود اس کو جھنجھوڑتے اور بیدار کرتے ہیں تاکہ دنیا ان کی طرف متوجہ ہو اور ان کی باتوں کو سنے۔ تو دنیا نے ہر قسم کی مخالفت کی مگر باوجود اس کے آپ خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے سے باز نہ آئے اور ہر قوم اور ہر ملت کو آپ نے وہ پیغام پہنچایا جس پیغام کا پہنچانا خدا تعالیٰ نے آپ پر فرض کیا ہؤا تھا۔ یہاں اپنے آپ کو ہلاکت اور خطرے میں ڈالنا یقیناً مفید تھا کیونکہ اس کے متعلق ایک دن کا انتظار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دن بھی اپنے دعویٰ کو نمرود کی خاطر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ ایک گناہ تھا اور اس کا ارتکاب ان کے لئے کسی صورت میں بھی جائز نہیں تھا بلکہ اس لئے بھی کہ ابراہیمؑ کو کیا معلوم تھا کہ شاید وہی دن ان کی قوم کی ہدایت کا دن ہو یا وہی دن ان کی موت کا دن ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دن کے لئے بھی اپنے دعویٰ کو ملتوی نہیں کر سکتے تھے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ سراسر ناجائز اور گناہ تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ موسیٰؑ کو کیا معلوم تھا کہ شاید وہی دن فرعون کی ہدایت کے لئے مقدّر ہو یا وہی دن ایسا ہو جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی موت مقدّر ہو۔ یہی حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ یہی حال رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا تھا اور یہی حال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تھا۔ یہ بھی اپنے اپنے

دعووں کو ایک دن کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے کیونکہ یہ نہیں جانتے تھے کہ شاید وہی دن ان کی قوموں کے لئے ہدایت کا دن ہو یا شاید وہی دن ایسا ہو جس میں ان کا وفات پا جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہو۔ پس انہوں نے اپنے دعووں کو پیش کیا اور پیش کرتے چلے گئے۔ بے شک مخالفتیں ہوئیں اور شدید مخالفتیں ہوئیں مگر انہوں نے ایک دن کے لئے بھی اپنے دعووں کو ملتوی نہیں کیا اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ ملتوی نہیں کر سکتے تھے مگر دنیا میں بعض ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں ملتوی کیا جا سکتا ہے جیسے دنیوی جھگڑے ہیں۔ انسان ان کے متعلق یہ خیال بھی کر سکتا ہے کہ اگر میں نے ان جھگڑوں کو ملتوی کر دیا اور مَیں مر گیا تو بھی کوئی بڑا نقصان نہیں ہو گا۔ یہی خیال دوسرا فریق کر سکتا اور اس طرح اپنے جھگڑوں کو ملتوی کر سکتا ہے تو جس جگہ پر کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جسے کسی صورت میں بھی ملتوی نہیں کیا جا سکتا یا ایسی ہوتی ہے جسے کسی صورت میں بھی قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اس جگہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا یا اپنی قوم کو خطرے میں ڈال دینا غیرت کہلاتا ہے۔ یا عقل کسی کامیابی کی یقینی طور پر امید دلاتی ہو، چاہے وہ دینی امر نہ ہو تو وہاں بھی اپنی جان کو یا اپنی قوم کی جانوں کو خطرے میں ڈالنا غیرت کہلاتا ہے۔ اور ایسا فعل دور اندیشی پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب بات ایسی ہو جسے چھوڑا جا سکتا ہو یا بات ایسی ہو جس کے متعلق انتظار کیا جا سکتا ہو اور اس انتظار میں اپنا اور اپنی قوم کا فائدہ ہو لیکن انسان پھر بھی مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور مقابلہ بھی ایک ایسے دشمن کا کرے جس کے ساتھ لڑنے کی طاقت انسان کے اندر نہ ہو تو یہ تہوّر اور جنون ہو گا۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسلمانوں کو جہاد کے متعلق تعلیم دی۔ آپ نے فرمایا اب کافروں سے جنگ کے لئے جانا دین نہیں کہلا سکتا اور نہ موجودہ زمانہ میں کافروں سے جنگ کرنا غیرت کہلا سکتا ہے۔ اس لئے کہ دشمن کے مقابلہ کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں وہ تم میں موجود نہیں۔ تم میں عزم نہیں۔ تم میں استقلال نہیں۔ تم میں ہمت نہیں۔ تمہارے پاس جتھا نہیں۔ تمہارے پاس دولت نہیں۔ تمہارے پاس حکومت نہیں۔ غرض جو چیزیں کسی قوم کو کامیاب کیا کرتی ہیں وہ تمہارے پاس موجود نہیں ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض دفعہ انسان کے پاس وہ چیزیں بھی نہیں ہوتیں جو مقابلہ کے لئے ضروری ہوتی ہیں مگر پھر بھی

اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قربانی میں ڈال دے۔ آخر موسیٰ علیہ السلام کے پاس ان میں سے کونسی چیز موجود تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ان میں سے کونسی چیز موجود تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ان میں سے کونسی چیز موجود تھی، رسول کریم صَلَّىَاللّٰہُعَلَیۡہِوَسَلَّم کے پاس ان میں سے کونسی چیز موجود تھی۔ خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جو یہ نصیحت کر رہے تھے ان کے پاس اس میں سے کونسی چیز موجود تھی۔ آپ جن باتوں کا ذکر کر رہے تھے اور مسلمانوں سے فرما رہے تھے کہ چونکہ یہ چیزیں تمہارے پاس نہیں ہیں اس لئے غیر قوموں سے لڑائی کرنا تمہارے لئے جائز نہیں۔ تمہارے پاس دولت نہیں، تمہارے پاس جتھا نہیں، تمہارے پاس تلوار نہیں، تم میں طاقت اور ہمت نہیں۔ اس لئے اے مسلمانو! تم غیر قوموں کے مقابلہ کے لئے مت نکلو۔ یہ چیزیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس کب تھیں۔ عزم و استقلال تو انبیاء میں ہوتا ہی ہے۔ دولت، حکومت، جتھا اور ظاہری طاقت و قوت میں سے کون سی چیز حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس تھی یا کب یہ چیزیں محمد صَلَّىَاللّٰہُعَلَیۡہِوَسَلَّم کے پاس تھیں۔ کب یہ چیزیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس تھیں۔ کب یہ چیزیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تھیں۔ کب یہ چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھیں۔ کب یہ چیزیں حضرت نوح علیہ السلام کے پاس تھیں۔ مگر باوجود اس کے کہ ان سامانوں میں سے کوئی سامان بھی ان کے پاس نہ تھا پھر بھی وہ دشمنوں کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو گئے اور اس مقابلہ میں وہ ہرگز قابلِ الزام نہ تھے، وہ ہرگز قابلِ ملامت نہ تھے بلکہ وہ قابلِ تعریف تھے۔ اس لئے کہ جس چیز کی حفاظت کے لئے وہ کھڑے ہوئے تھے اور جس لڑائی میں وہ حصہ لے رہے تھے اس میں گو ظاہری حفاظت کے سامان ان کے پاس موجود نہیں تھے مگر ان دنیوی سامانوں سے بڑھ کر ایک اور امید دلانے والی چیز ان کے پاس موجود تھی۔ اور وہ خدا کا وعدہ تھا جس کے بھروسہ پر مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ نوح علیہ السلام کے پاس یہ سامان نہیں تھے مگر پھر بھی وہ اس لئے دشمن کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے کہ خدا کی طرف سے یہ وعدہ تھا کہ ہم ان سامانوں کی بجائے اپنی نصرت اور مدد تمہارے شاملِ حال رکھیں گے۔ پس انہوں نے دشمن کا مقابلہ کیا مگر ان سامانوں کی بناء پر نہیں بلکہ

خدا تعالیٰ کے وعدہ کے برتے اور بھروسے پر۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھی یہ سامان نہ تھے مگر ان سے بڑھ کر ان کے پاس سامان موجود تھا اور وہ خدا کا وعدہ تھا جو انہیں حاصل تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھی ان سامانوں میں سے کوئی سامان موجود نہ تھا مگر ان سے بڑھ کر ایک اور سامان ان کے پاس تھا اور وہ خدا کا اپنی مدد اور نصرت نازل کرنے کا وعدہ تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس بھی ان سامانوں میں سے کوئی سامان موجود نہ تھا۔ مگر ایک چیز تھی جس کے بھروسہ پر وہ تن تنہا دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور وہ خدا کا وعدہ تھا۔ رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے پاس بھی کامیابی کے ان ظاہری سامانوں میں سے کوئی سامان نہ تھا مگر ان سے بڑھ کر ایک اَور چیز آپ کے پاس تھی اور وہ خدا کی مدد اور اس کی نصرت کا وعدہ تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس بھی ان سامانوں میں سے کوئی سامان موجود نہ تھا مگر ان سے بڑھ کر ایک اَور سامان آپ کے پاس تھا اور وہ خدا کا وعدہ تھا کہ میں تجھے ضرور کامیاب کروں گا۔ لیکن وہ مسلمان جو اس زمانہ میں جنگ کے لئے جانا چاہتے تھے ان کے ساتھ خدا کا کون سا وعدہ تھا کہ وہ انہیں کامیاب کرے گا بلکہ ہمیں تو الٹا یہ دکھائی دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ ان کے خلاف تھا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان سے بھی کہا کہ رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے یہ فرمایا ہے کہ مسیح موعود جنگوں کا التوا کر دے گا۔ پس خدا تعالیٰ کا وعدہ جنگ کرنے والے مسلمانوں کی تائید میں نہیں بلکہ اس کے مخالف ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان اگر ان حالات میں دشمن کا مقابلہ کریں تو اسے تہوّر کہا جائے گا کیونکہ ان کے پاس وہ سامان نہیں جو مقابلہ کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن ویسے ہی حالات میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو خدا تعالیٰ کے فرستادوں میں سے ایک عظیم الشان فرستادہ تھے جب دشمن کا مقابلہ کیا تو ان کے فعل کو تہوّر نہیں کہا جائے گا، جنون نہیں کہا جائے گا بلکہ ایک لازمی اور ضروری فرض کہا جائے گا جو انہوں نے ادا کیا کیونکہ آپ کے پاس ان سامانوں سے بہتر سامان موجود تھا۔ صرف فرق یہ ہے کہ آپ کے پاس مادی سامان موجود نہ تھے، روحانی سامان آپ کے پاس تھے۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسلمانوں کو بتایا کہ تمہارے پاس تو دونوں سامان موجود نہیں۔ نہ مادی سامان تمہارے پاس

موجود ہیں اور نہ روحانی سامان تمہارے پاس موجود ہیں۔ پس خدا کا حکم یہ ہے کہ تم ان حالات میں دشمن سے ہرگز جنگ نہ کرو۔ اگر کرو گے تو شکست کھاؤ گے کیونکہ فتح اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ظاہری سامان تمہارے پاس ہوں یا روحانی سامان تمہارے پاس ہوں۔ جب تمہارے پاس نہ روحانی ہتھیار ہیں اور نہ جسمانی ہتھیار ہیں تو تم ان دونوں کی عدم موجودگی میں دشمن سے یقیناً شکست کھاؤ گے۔

مَیں اس وقت دنیا کی حالت پر جتنا بھی غور کرتا ہوں مجھے زیادہ سے زیادہ اس بات پر یقین ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کی فتح اور مسلمانوں کا غلبہ محض تبلیغ سے وابستہ ہے۔ تبلیغ کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی کوئی صورت نہیں۔ ابھی کل سے لبنان کے متعلق عجیب و غریب خبریں آ رہی ہیں۔ شام اور لبنان وہ ملک ہیں جو کسی زمانہ میں ترکوں کے ماتحت تھے اور ترکوں کی طرف سے انہیں ہر قسم کی وہ آزادی حاصل تھی جو کسی ماتحت قوم کو دی جاتی ہے۔ ان میں سے جرنیل بنائے جاتے تھے۔ انہیں بڑے بڑے عہدے سپرد کئے جاتے تھے یہاں تک کہ وزراء بھی انہیں میں سے بنائے جاتے تھے۔ گویا جس قدر بڑے بڑے عہدے ہیں خواہ وہ وزارتوں سے تعلق رکھتے ہوں یا اَور محکموں سے وہ سب کے سب ان کو دئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی انہیں ہر قسم کی سہولتیں حاصل تھیں اور ترکوں کا ان سے سلوک نہایت اچھا تھا۔ ترک اپنوں اور عربوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں کرتے تھے اور ہرگز یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ ہم ترک ہیں اور یہ عرب۔ اس لئے عہدے ہماری قوم کو ملنے چاہئیں عربوں کو نہیں ملنے چاہئیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترکی حکومت کی طرف سے جو گورنر مقرر ہؤا کرتے تھے وہ اکثر عادل نہیں ہوتے تھے مگر وہ گورنر بھی اپنے ظلم میں یہ امتیاز نہیں کیا کرتے تھے کہ فلاں ترک ہیں اور فلاں عرب۔ صرف اتنا ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے اور رعایا کو خواہ ترک ہو یا عرب چھوٹا سمجھتے تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے۔ گویا عرب اور ترک میں ان کو کوئی امتیاز نہ تھا۔ صرف چھوٹے اور بڑے کا فرق تھا۔ جب گزشتہ جنگ ہوئی تو ان اقوام کو یورپ کی حکومتوں نے کہا کہ ہم تمہیں آزادی دے دیں گے تم اپنے حاکموں کے خلاف کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ یہ قومیں کھڑی ہو گئیں اور انہوں نے اپنے حکام کے ساتھ

غدّاری کی اور ان سے جنگ پر آمادہ ہو گئے اور سمجھا کہ اس کے نتیجہ میں ہم کو آزادی مل جائے گی مگر جب جنگ ختم ہو گئی اور ان کے خون سے عرب اور شام کے میدان رنگے گئے تو انہیں یہ آزدی دی گئی کہ کچھ حصہ پر انگریزوں کو نگرانی دی گئی اور کچھ حصہ فرانسیسیوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اب پھر یہ دوسری جنگ آئی اور اس جنگ کے شروع میں ہی فرانس کو شکست ہو گئی۔ چونکہ شام اور لبنان کے علاقے اس فرانسیسی حکومت کے ماتحت تھے جس کا جرمنی کے ساتھ تعلق تھا اس لئے اتحادیوں کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ کہیں ایسا نہ ہو جرمنی اور اس کے فرانسیسی ساتھی ان ممالک کو اڈہ بنالیں اور ہمارے علاقوں میں شرارت پھیلانا شروع کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ نہایت اچھی جنگی چال چلی کہ ان ممالک پر حملہ کر دیا اور آزاد فرانسیسی دستوں کے کمانڈر نے اعلان کیا کہ تم مدت سے آزادی کے طالب تھے مگر تمہیں فرانسیسی گورنمنٹ آزادی نہیں دیتی تھی اب وقت آ گیا ہے کہ تمہیں آزاد کر دیا جائے اور تمہارا شمار بھی دنیا کے آزاد ممالک کی صف میں ہو۔ تم اس وقت ہماری مدد کرو۔ تم کو عملاً آزادی دے دی جائے گی اور جنگ کے ختم ہونے پر تمہیں ہم پوری آزادی دے دیں گے۔ اس اعلان پر پھر وہ لوگ جو ایک عرصہ سے آزادی کے خواب دیکھ رہے تھے میدان میں نکل آئے اور انہوں نے کہیں سڑکیں توڑنی شروع کر دیں، کہیں ریلوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا اور اس طرح ملک کے اندرونی حصوں میں بغاوت پیدا کر دی تاکہ انہیں آزادی حاصل ہو۔ باہر سے انگریزوں نے آزاد فرانسیسی دستوں کے ساتھ مل کر حملہ کر دیا اور چند دنوں میں ہی شام اور لبنان وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ جب جنگ ختم ہوئی اور قبضہ مکمل ہو گیا تو آزاد فرانس کے نمائندہ کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ لو اب تم آزاد ہو۔ کچھ عرصہ تک تو وہ خاموش رہے۔ آخر انہوں نے سوچا کہ ہماری آزادی کا اعلان تو کر دیا گیا ہے مگر ہم آزاد ہیں کس طرح۔ انہوں نے کہا بے شک آپ نے کہہ دیا ہے کہ ہم آزاد ہیں مگر ہم کس طرح سمجھیں کہ ہم آزاد ہیں۔ فوج تمہاری ہے، گورنر تمہارے ہیں، پولیس تمہاری ہے، تمام طاقت کے عہدے تمہارے پاس ہیں۔ پھر ہم کس طرح آزاد ہو گئے؟ ہم بہتیری کوشش کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو آزاد سمجھیں مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آزادی کے معنے کیا ہیں۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کمیٹی نے یہ

فیصلہ کر دیا کہ جب حکومت کے اپنے اعلان کی رو سے ہم آزاد ہیں تو لو آج سے ہم اپنے لئے آپ قانون بناتے ہیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے پارلیمنٹ میں بھی ایک بل پیش کر دیا گیا۔ یہ دیکھ کر فرانس کی وہ آزادی کی کمیٹی جس کے ماتحت وہ آ گئے تھے اس نے ان کو دبانا شروع کر دیا کہ تمہیں اپنے ملک کا قانون بنانے کا کس نے اختیار دیا ہے اور تمہارا حق ہی کیا ہے کہ تم اس قسم کی باتیں کرو۔ بے شک ہمارے اعلان کے مطابق تم آزاد ہو مگر اس آزادی کی تعبیر بتانا ہمارا کام ہے۔ تمہارا حق نہیں کہ آپ ہی آپ آزادی کا ایک مفہوم لے لو اور اس کے مطابق اپنے ملک کا آئین مرتب کرنے لگ جاؤ۔ تمہاری آزادی کی تعبیر ہمارے سپرد ہے۔ تم کہاں سے یہ حق لے کر آ گئے ہو کہ اپنے متعلق آپ قانون بناتے پھرو۔

پھر ہم نے کل ایک اَور خبر پڑھی جو عجیب قسم کی ہے۔ دنیا کے تمام آزاد ممالک کا یہ طریق ہے کہ ان کی طرف سے ہمیشہ اس قسم کے اعلانات ہوتے ہیں کہ وزیر اعظم نے یا وزارت نے اتنے لوگوں کو قید کر لیا۔ وہ قید کرنا جائز ہوتا ہے یا ناجائز اس پر یہاں بحث نہیں۔ کبھی وزارتوں کی طرف ظلم بھی ہوتا ہے اور کبھی عدل و انصاف کے ماتحت وہ مجرموں کو قید کرتے ہیں لیکن بہر حال اعلانات یہ ہوتے ہیں کہ وزیروں نے اتنے لوگوں کو پکڑ لیا یا فلاں وزارت نے اتنے لوگ گرفتار کر لئے۔ مگر کل ہم نے یہ عجیب خبر پڑھی کہ آزاد لبنان کے وزیروں کو پکڑ کر قید کر لیا گیا ہے۔ بے شک یہ مضحکہ خیز باتیں ہیں مگر یہ ساری کی ساری اسی امر کی طرف توجہ دلاتی ہیں جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان الفاظ میں پیش کیا کہ ؎

یہ حکم سن کے بھی جو لڑائی کو جائے گا
وہ کافروں سے سخت ہزیمت اٹھائے گا[1]

آج مسلمانوں اور ایشیائیوں کے لئے دنیا کے پردہ پر قطعاً لڑائی کا وقت نہیں (لبنانی اکثر مسیحی ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان پر بھی مسلمانوں ہی کا قانون چسپاں ہوتا ہے وہ اکیلے نہیں جیت سکتے۔ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہی جیت سکتے ہیں) آج ایک ہی ذریعہ ان کے لئے باقی ہے کہ وہ دشمن کے قلب پر حملہ کر کے اسے فتح کریں یعنی تبلیغ اور

دعاؤں اور انابت کے زور سے وہ ان غالب اقوام کے مذہب کو بدل ڈالیں اور انہیں اپنا بھائی بنا لیں۔ پس ان پر غلبہ پانے کی یہی راہ نہیں کہ توپ اور تفنگ سے کام لیا جائے یا تلوار اور موجودہ زمانہ کے اسلحہ سے انہیں مغلوب کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تمام ہتھیار آج بے کار اور لغو ہیں۔ ان ہتھیاروں سے کام لینے والا کبھی فتح کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ صرف ایک ہی چیز آج مسلمانوں کے پاس ہے کہ وہ اس سچائی کو جو خدا نے ان کی طرف نازل کی۔ ان لوگوں تک پہنچائیں، ان کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کریں، ان کے قلوب میں ایمان کی چنگاری روشن کریں اور انہیں تبلیغ کے زور سے اسلام میں داخل کر لیں۔ جب تک وہ اس ذریعہ سے کام نہیں لیتے، جب تک وہ خدا تعالیٰ کے اس بتائے ہوئے ہتھیار کو نہیں چلاتے، جب تک وہ قرآن اور اسلام کی تلوار سے کفر و شرک کو نہیں کاٹتے اس وقت تک وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ اس وقت تک ان کی غلامی کی زنجیریں کبھی کٹ سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے آج تک اپنی آزادی کے لئے جس قدر کوششیں کیں ان میں وہ ناکام ہوئے۔ صرف اس قدر تغیر ہوا کہ ایک وقت میں وہ غلام کہلاتے تھے دوسرے وقت میں خادم کہلانے لگ گئے۔ اب تیسرے وقت میں وہ آزاد بھی کہلا سکتے ہیں مگر یہ ساری چیزیں ایک ہی ہوں گی۔ جب وہ غلام کہلاتے تھے تب بھی ماتحت تھے۔ جب وہ خادم کہلاتے تھے تب بھی ماتحت تھے۔ اور جب وہ آزاد کہلائیں گے تب بھی ماتحت ہی ہوں گے۔ انہوں نے اپنی غفلت اور کوتاہی سے وہ زمانہ کھو دیا جب وہ آزادی حاصل کر سکتے تھے۔ اور خود انہوں نے اپنے آپ کو غیر قوموں کے سپرد کر دیا۔ کتنی بڑی سپین کی حکومت تھی، کتنی بڑی ترکوں کی حکومت تھی، کتنی بڑی ہندوستان کی حکومت تھی، جب خود ان لوگوں نے غفلتیں کیں، نالائقیاں کیں، تعیش میں مبتلا ہو گئے، علم پڑھنا ترک کر دیا، جرأت اور بہادری کے وصف سے عاری ہو گئے، دیانت و امانت کا مادہ ان میں نہ رہا، غداری، دھوکے بازی اور فریب کاری ان کا شیوہ بن گیا، غریبوں سے نیک سلوک کرنا ان کا وصف نہ رہا اور انہوں نے ایک ایک کر کے تمام خوبیاں اپنے اندر سے مٹا ڈالیں اور دلوں میں شیطان کے پورے غلام بن گئے تو خدا نے ان کو ظاہر میں بھی غیر قوموں کا غلام بنا دیا۔ اس میں کسی کو کیا گلہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ سے کسی نے

پوچھا کہ یارسول اللہ! گری پڑی چیز کے متعلق کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تمہیں کہیں کوئی مرغی مل جائے یا بکری مل جائے تو اسے لے لو اور اِدھر اُدھر آواز دو تا کہ تمہیں اس کا مالک مل جائے۔ اگر مل جائے تو وہ چیز اس کے حوالے کر دو۔ نہیں تو خود لے جاؤ کیونکہ اگر تم نہیں لے جاؤ گے تو بھیڑیا اسے لے جائے گا۔ لیکن اگر کوئی تھیلی پڑی ہوئی تمہیں مل جاتی ہے یا کوئی ایسا مال ملتا ہے جو معین صورت میں پہچانا جا سکتا ہے تو اس کو ایک عرصۂ دراز تک بطور امانت اپنے پاس رکھو۔ اور جب بھی کسی مجلس میں جاؤ اعلان کر دیا کرو کہ مجھے ایک تھیلی ملی ہے یا کچھ مال ملا ہے جس کا ہو وہ پتہ بتا کر لے جائے۔ مثلاً تھیلی ہو تو مالک اس کا رنگ بتائے گا، رقم کی مقدار بتائے گا۔ اسی طرح اور کوئی علامت بتائے گا جس سے یہ علم ہو سکے گا کہ تھیلی اس کی ہے یا نہیں اور جب تمہیں اس کا مالک مل جائے تو وہ تھیلی یا مال اس کے حوالے کر دو۔ اس نے کہا یارسول اللہ! اگر اونٹ مل جائے تو کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا تجھے اونٹ سے کیا؟ وہ آپ اپنی حفاظت کر لیتا ہے۔ یہی قوموں کا حال ہے۔ جو اونٹ بنتا ہے اس کو کوئی پکڑ نہیں سکتا مگر وہ جنہوں نے اپنے آپ کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح بنا لیا انہیں اگر انگریز نہ لیتے تو فرانسیسی لے لیتے۔ فرانسیسی نہ لیتے تو پرتگیزی لے لیتے۔ پرتگیزی نہ لیتے تو امریکن لے لیتے۔ جو حالت ہندوستان کی تھی اسے دیکھتے ہوئے کون اسے چھوڑ سکتا تھا۔ جہاں مالک کا پتہ ہی نہ لگتا ہو کہ کون ہے اور کہاں ہے اس ملک پر اگر کوئی غیر قوم قبضہ کر لے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ ہندوستان پر انگریزوں نے کیوں قبضہ کر لیا بالکل غلط ہے۔ ہندوستان پر انگریز قابض نہ ہوتے تو فرانسیسی قابض ہوتے۔ فرانسیسی قابض نہ ہوتے تو پرتگیزی قابض ہوتے۔ پرتگیزی قبضہ نہ کرتے تو ولندیز قبضہ کر لیتے۔ ولندیز قبضہ نہ کرتے تو جرمن قبضہ کر لیتے۔ جرمن قبضہ نہ کرتے تو امریکن قبضہ کر لیتے۔ بہرحال کسی نہ کسی قوم نے ہندوستان پر ضرور قبضہ کرنا تھا۔ پس اس میں انگریزوں کا کیا قصور ہے۔ انہیں ایک گری پڑی چیز ملی اور اس کو انہوں نے اٹھا لیا۔ جب ہم نے خود اپنے آپ کو ایک زمین پر گری پڑی چیز کی طرح بنا لیا، جب ہم نے خود اپنے آپ کو تباہ کر لیا، جب اپنے اتحاد کو ہم نے مٹا دیا، جب علم کو ہم نے کھو دیا، جب انسانیت کو ہم نے خیرباد کہہ دیا، جب انانیت کو ہم نے فنا کر دیا، جب تک نیک اخلاق اور حکومت کے قابل

بنانے والے اوصاف کو ہم نے ضائع کر دیا تو اس کے بعد میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں رہتی کہ یہ اعتراض کیا جائے کہ انگریزوں نے ہندوستان لے لیا۔ انہوں نے ہندوستان لے لیا تو اس وجہ سے کہ ہم ایک گری پڑی چیز تھے۔ انہیں یہ چیز نظر آئی اور اس کو انہوں نے اٹھا لیا۔ پس یہ سوال ہی بالکل غلط ہے کہ انہوں نے ہندوستان کو ناجائز طور پر لے لیا۔ یہ ایک خدائی قانون ہے کہ جب کوئی قوم اپنے آپ کو گری پڑی چیز ہی کی طرح بنا لیتی ہے تو اس وقت کوئی نہ کوئی اسے ضرور اٹھا لیتا ہے۔ اور سب سے مقدم حق اس کا ہوتا ہے جو اس چیز کو سب سے پہلے دیکھے یا سب سے پہلے اسے اٹھالے۔ جیسے اگر کسی گری پڑی چیز کو چار پانچ آدمی دیکھیں تو جو شخص دوڑ کر پہلے اٹھالے گا وہ چیز اس کی ہو جائے گی اور جو بعد میں آئے گا اسے اس سے محروم رہنا پڑے گا۔ جیسے ہندوستان میں انگریز بھی آئے اور بعض دوسری قومیں بھی مگر انگریزوں نے ہندوستان پر پہلے قبضہ کر لیا اور دوسری قومیں اس سے محروم ہو گئیں۔ تو قانون یہی ہے کہ گری پڑی چیز جسے مل جائے وہ اسے اٹھا کر اپنے قبضہ میں کر لے۔ ہم بچے تھے تو ایک کھیل کھیلا کرتے تھے کہ جب کوئی چیز اتفاقاً ہمیں مل جاتی تو ہم دوڑ کر اسے اٹھا لیتے اور کہتے " لبھی چیز خدا دی نہ دھیلے دی نہ پا دی۔" یعنی جو چیز پڑی ہوئی ملے نہ وہ دھیلے سے حاصل ہوتی ہے نہ پائی سے بلکہ وہ تو خدا کی ہے۔ یعنی مفت کا مال ہے۔ اس "خدا دی" کا مطلب یہ نہیں ہوا کرتا تھا کہ یہ صرف خدا کی ہے ہماری نہیں بلکہ مطلب یہ ہوا کرتا تھا کہ چونکہ یہ چیز خدا کی ہے اور ہم خدا کے بندے ہیں اس لئے یہ چیز ہماری ہے۔ تو بات یہ ہے کہ گری پڑی چیز جسے مل جائے وہ اسے اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ اگر چار پانچ شخص اکٹھے کسی چیز کو دیکھیں تو جو دوڑ کر پہلے اٹھا لے وہی اس کا مالک ہوتا ہے۔ جیسے ہندوستان میں فرانسیسی بھی آئے، پرتگیز بھی آئے، انگریز بھی آئے اور سب کی ہندوستان پر اکٹھی نظر پڑی مگر چونکہ انگریزوں نے دوڑ کر ہندوستان کو پہلے لے لیا اس لئے وہ اس کے مالک بن گئے۔ پس یہ اعتراض بے وقوفی کا اعتراض ہے۔ تفصیلات میں بے شک اعتراض ہو سکتا ہے مگر اس بات میں پڑنا بالکل بے وقوفی ہے کہ ہندوستان پر انگریزوں نے کیوں قبضہ کر لیا۔ اصل چیز جو ہمارے مدنظر رہنی چاہئے اور جسے ہر وقت ہمیں آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ جس خدا نے ہم کو اپنی غفلتوں کی وجہ سے یہ سزا دی ہے کہ

ہمیں انگریزوں کا غلام بنا دیا اسی خدا نے ایک چمکتا ہؤا روشن ستارہ قرآن کی صورت میں ہمارے ہاتھ میں دیا ہے اور فرمایا ہے کہ جاؤ اور اس قرآن کے ذریعہ سے تم اپنے آقا کو غلام بنا لو۔ جاؤ اور تم قرآن کے جادو کے زور سے اپنے حاکموں کو اپنا تابع فرمان بنالو۔ اگر آج تم قرآن کے جادو سے اپنے آقا کو غلام نہیں بناتے تو یہ تمہاری دوسری غفلت اور کوتاہی ہو گی۔ پہلے بھی تم اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے غلام بنے اور اب بھی تم اگر قرآن کے ذریعہ ان کو اپنا غلام نہیں بناؤ گے تو یہ تمہاری دوسری جہالت ہو گی اور تم پھر ان کی غلامی میں ہی رہو گے۔ یہ وہ ہتھیار ہے جو خدا نے ہم کو دیا۔ یہ وہ نور ہے جس کے ذریعہ اس نے کفر کی طاقتوں کو نیچا دکھانے کا فیصلہ کیا مگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم سونٹے کے ذریعہ آقا کو غلام بنائیں گے۔ حالانکہ پہلا سونٹا جو مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اس سے انہوں نے خود کام نہ لیا۔ دوسرا سونٹا انہوں نے دشمنوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب یہ تیسرا سونٹا قرآن کے ذریعہ انہیں ملا تھا مگر وہ اس سونٹے سے بھی کام نہیں لیتے اور کہتے ہیں ہم ظاہری سونٹے اور ظاہری سامانوں سے ان کو اپنا غلام بنائیں گے مگر وہ یاد رکھیں اپنے ان ارادوں میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ سونٹا اب ان کے سر پر ہی پڑے گا۔ ان کے آقا کے سر پر نہیں پڑے گا۔ پس وہ لوگ جو اس سونٹے سے کام لینا چاہتے ہیں وہ اپنا سر آپ پھوڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی کامیابی کو آپ پیچھے ڈالنا چاہتے ہیں۔ آج صرف ایک ہی چیز ہے جو مسلمانوں کو کامیاب بنا سکتی ہے اور وہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو دلوں کو مسخر کر لے اور دلوں کو مسخر کرنے کے لئے سوائے تبلیغ کے اور کوئی ہتھیار نہیں۔ یہی تبلیغ کا ہتھیار ہے جو خدا نے ہمیں دیا۔ جتنی جلدی مسلمان اس ہتھیار کو استعمال کریں گے اتنی ہی جلدی انہیں غیر اقوام سے آزادی حاصل ہو گی۔ اور جتنی دیر وہ اس ہتھیار کے استعمال کرنے میں لگائیں گے اتنی ہی ان کی غلامی کی زنجیریں لمبی اور ممتد ہوتی چلی جائیں گی۔(اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ)"

(الفضل 20 نومبر 1943ء)

1: درثمین اردو صفحہ 59، ضمیمہ تحفہ گولڑویہ روحانی خزائن جلد نمبر 17 صفحہ 78